بینش فاطمہ

لیکچرار اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی اسلام آباد ۔

"ڈاکیا اور جولاہا" میں کرداروں کی علامتی معنویت

Beenish Fatima

Lecturer Urdu, Federal Urdu University of Arts,Science &Technology , Islamabad

The symbolic Significance of the characters in ‘‘Dakiya aur Jolaaha’’

The novel emerges as a representative genre of modernity that combines reality and imagination to present human life in art. The main role of the author is to create art through the interplay of plots, scenes and characterization of all aspects of society. In fiction, layering and embellishment are considered proof of artistic maturity and perfection. The texture of the narrative, the perfection of the metaphors and formation of characters are the three main elements of the story. Distinction, meticulousness and insight are essential in characterization. The psychology of the characters in the novel is that scale. In this way the author determines the stages of communications through the respondent’s expression. Mustansir Hussain Tarar’s masterpiece ‘‘Dakiya Aur Jolaaha’’ is a symbolic philosophical novel in which the realities of survival and annihilation have been resolved through the symbolic characters of the post man, weaver, Rodin and Natalia. In Tarar’s creations , female characters are always stronger and more vivid than male characters. In this novel the author has exposed art, love, rebel and spirituality as well as various aspects of outdated traditions with the help of Natalia’s character. In fact ‘‘Dakiya aur Jolaaha’’ is the sequel to‘‘Qurbat.e. Marg meinMuhabbat’’ , but its style is very different which makes it unique.

فکشن میں تہہ داری اور ایمائیت فنی پختگی اور مہارت کی دلیل سمجھی جاتی ہیں۔ بیانیہ کی بنت، محاکات میں کمال اور کرداروں کی تشکیل کہانی کے تین اہم عناصر ہیں۔ کردار نگاری میں عرق ریزی، باریک بینی اور بصیرت

از حد لازم ہے۔ ناول میں موجود کرداروں کی نفسیات وہ پیمانہ ہے۔ جس سے مصنف کا مدعا اظہار سے ابلاغ کی منزلیں طے کرتا ہے۔ زندہ محرک اور جاندار کردار تخلیق اور تخلیق کار دونوں کی ادبی قامت کا تعین کرتے ہیں جب کہ بے جان جامد اور بے حس کردار وقتی اور عارضی ٹھہرتے ہیں۔ بوقلمونی، رنگارنگی اور انفرادیت کرداروں کی تعمیر میں ملحوظ رکھنا بنیادی اصول ہیں۔ ایک مصنف یا تخلیق کار اپنے معاشرے کا عکاس اور نباض ہوتا ہے جو اس معاشرے سے ہی کردار لے کر ناول یا افسانے کی کہانی کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ گہرا مشاہدہ، عمیق مطالعہ اور تجربہ ایسے ہتھیار ہیں جو کرداروں کی بناوٹ میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کی شہ کار تصنیف "ڈاکیا اور جولاہا" ایک علامتی ناول ہے جس میں کردار اور اشیاء مختلف خیالات اور خصوصیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ تمام علامتیں ناول کو کافی پیچیدہ بنادیتی ہیں۔ ناول کے نام "ڈاکیا اور جولاہا" میں موجود دونوں کردار علامتی ہیں۔ ڈاکیا اور جولاہا کی معنویت ناول کے ساتھ آشکار ہوتی ہے۔ ڈاکیا جس کا کام مختلف لوگوں کی ڈاک انت تک پہنچانا ہے لیکن محمد علی ڈاکیا عام ڈاکیا نہیں ہے۔ وہ شاید اس دنیا کا نظام چلانے والے کی طرف سے مختلف پیغامات مختلف لوگوں کو مختلف مقامات پر پہنچاتا ہے۔ محمد علی ڈاکیا حضرت عزرائیل کی شکل اختیار کرتا بھی نظر آتا ہے۔ اسی طرح جولاہا اور اس کے فن کو ادب اور ادب کی تخلیق سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جس طرح جولاہا سوت کاتتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب سب کچھ خود سے ہونے لگتا ہے اور اس کا عمل دخل کم ہو جاتا ہے بالکل اسطرح جیسا کہ ایک لکھاری مختلف کردار تخلیق کرتا ہے مگر اُس کے بعد وہ کردار خود فیصلے کرنے لگ جاتے ہیں اور فن پارے جب تخلیق ہوتے ہیں تو وہ کچھ اور ہوتا ہے جیسا کہ مستنصر حسین تارڑ ناول میں خود کہتے ہیں۔

"میں بھی دھیان تو کرتا ہوں لیکن میری تحریر کی ہتھی ڈھلک جاتی ہے۔۔۔ تکلا جھول جھول جاتا ہے اور تند ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔۔۔ پھر ان اٹیوں سے تانا پیٹا لگتا ہے۔۔۔ مسلسل دھاگے بنتے ہیں۔۔۔ رنگے جاتے ہیں اور اور تب جا کر وہ جولاہے کی کھڈی میں سجتے ہیں۔۔۔ اور پھر ایک کھیس وجود میں آتا ہے۔۔۔ یہ ناول۔۔۔ جو شاید ناول نہیں۔۔۔ محض کپاس کے پھول اور اس کے ایک کھیس شکل میں نمودار ہونے کا قصہ ہے۔۔۔"

(1)

جہاں جولاہے کے کام اور ناول کی لکھت کو تمثیل دی گئی ہے وہیں فن کی تخلیق کے مرحلے کو بھی بیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کیونکہ ڈاکیا اور جولاہا، اور "قربتِ مرگ میں محبت" دونوں کے مرکزی کردار لکھاری ہیں اور ان کی زندگی میں موجود نسوانی کردار ان سے کم نہیں ان کے اس فن

کی وجہ کر کے ان سے آجڑے ہیں۔ ان کا لکھاری ہونا ہی ان کی توجہ کی وجہ بنا ہے جس کی وجہ سے مختلف لوگ ان سے جڑنے کی سعی کرتے ہیں لکھت ہی ان کو دوسرے کرداروں سے ممتاز کرتی ہے تو لکھت کیا ہے؟ لکھت کیسے تخلیق ہوتی ہے اور اس کے کیا کیا مراحل ہیں؟ ان تمام سوالوں کا جواب مختلف مثالوں سے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے کہ ناول میں لکھت اور سوت کاتنے کی مماثلت یوں بیاں کی گئی ہے۔

"کیا آپ کو کھٹ کھٹ کی آواز آئی؟

یہی تو میری کھڈی کی آواز ہے۔۔۔ جو میری اس نیم تاریک کوٹھڑی سے نکل کر۔۔۔ جہاں میں ایک گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے بٹھا ہوں۔۔۔ آپ کے کانوں پر کھٹ کھٹ دستک دیتی ہے کہ۔۔۔ یہ کیس جو بنا جا رہا ہے صرف میرا نہیں آپ کا بھی ہے۔۔۔

اس میں بنے جانے والے دھاگوں میں صرف ایک دھاگا میرا ہے باقی سب آپ کی حیات سے مستعار لیے گئے ہیں۔۔۔"(2)

بہت ہی عمدہ طریقے سے فن کی تخلیق کا نظریہ بیاں کیا ہے کہ فن فقط تذکرہ نویسی یا سیرت نگاری نہیں ہے کیونکہ تخلیق کار کا فقط ایک دھاگہ ہے دوسرے لفظوں میں لکھاری کو مکمل نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اُس کی ذات شامل ہے مگر اس بنت کا کل نہیں ہے لکھت میں اُس کے علاوہ باقی تمام معاشرہ موجود ہے کیونکہ یہ تمام دھاگے معاشرے سے مستعار لیے گئے ہیں جیسا کہ ساختیات کا نظریہ کہتا ہے کہ الفاظ بھی لکھاری معاشرے سے لیتا ہے ان کا استعمال بھی معاشرے سے سیکھتا ہے تو اسطرح لکھت بھی معاشرے کی نمائندہ ہو تی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح جولاہا سب کچھ معاشرے سے لیتا ہے پھر سوت کات کے اُس کو کھیس کی شکل دیکر پھر معاشرے کو واپس کرتا ہے اُس کے بعد پھر یہ معاشرے کی مرضی اُس کو اس کی کیا اجرت دیں؟ اور دوسرا اُس بنت کے ساتھ جو سلوک کریں یہ پھر معاشرے کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ قاری کے ردعمل کا نظریہ (Reader-Response Theory) کہتا ہے کہ لکھاری لکھت مکمل کر لیتا ہے اس کو معنی دینے کا حق پھر قاری کے پاس چلا جاتا ہے کہ وہ اُس کو کس طرح سمجھتا ہے اس سے کیا مفاہیم اخذ کرتا ہے جیسے جولا ہے کا بنا کھیس کچھ لوگ پسند کریں۔ اور کچھ اُس میں خامیاں نکالیں کیونکہ کھیس بننے کے بعد اب جولاہے کا کام ختم اب وہ کچھ نہیں کر سکتا اسی طرح لکھت جب قاری کے ہاتھوں میں آتی ہے اُس وقت لکھاری کا کام ختم ہو جاتا ہے جس کو رولینڈ بارتھ (Roland Barthes) "مصنف کی موت (Death of The Author) سے تشبیہ

دیتا ہے انہیں تمام نظریات کا خلاصہ مختلف علامتوں کے حوالوں سے مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول میں اس طرح کرتے ہیں:

"میں ایک ایسا جولاہا ہوں جو لمحہ موجود تک صدیوں سے چلی آنے والی روایت کے تابع سیدھے سادھے۔۔۔ ترتیب والے۔۔۔ مخصوص نمونوں اور رنگوں کے کھیس بننے والا تھا اور اب مخمصے میں پڑ گیا ہوں۔۔۔ میں نے اگر یہ الجھے ہوئے دھاگوں والا۔۔۔ پھول کہاں آئے گا۔۔۔ پتہ کہاں نمودار ہو گا یہ جانے بغیر ایک نیا ترتیب کھیس بن بھی لیا تو اسے خریدے گا کون۔۔۔ کون ہیر اسے اپنے رنگلے پلنگ پر بچھانے کا خطرہ مول لے گی۔۔۔"(3)

مستنصر حسین تارڑ نے ناول میں شعوری رو (Stream of Consciousness)اور مکاتیبی(Epistolary)ناول کی طرز کے تجربات کیے ہیں، جن کو وہ الجھے دھاگوں اور بنا ترتیب کھیس سے عبارت کر رہے ہیں۔ مگر تجربات کے بعد ڈر کہ وہ سراہے جائیں گے بھی کہ نہیں وہ بلاشبہ جائز ہے کیونکہ یورپ میں اس طرز کے ناول کا کافی عرصہ سے رواج ہے۔ جبکہ اردو ادب میں بیک وقت بہت سے نظریات کو ایک ساتھ چلا کر ناول میں سمونا ایک نئی بات ہے مگر ایک اور بات کہ جولاہے کو وہ کھیس جو کہ الجھے دھاگوں سے بُنا جائے گا اُس کو بُننے پر کون مجبور کر رہا ہے وہ محمد علی ڈاکیا ہے اور محمد علی ڈاکیا تو خود سے نہیں آتا تو پھر اُس کو اُس نے بھیجا جس کے پاس فنا اور بقا کا ڈاک گھر ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی بھی لکھت یا فن کی تخلیق کے پیچھے فن کا خوف ہے جو کہ لکھاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ لکھے کیونکہ لکھت اس کو بقاء دے سکتی ہے اس کے علاوہ تو اُس کے پاس بقا کا کوئی راستہ نہیں اس کو ہر حال محمد علی ڈاکیا سے موصول شدہ خط کی تحریر کا حکم بجالاتے ہوئے فنا کی طرف جانا پڑے گا جس طرح جولاہے کے بنے دھاگوں میں سے ایک دھاگا اس کا اپنا ہے اُسی طرح لکھت کو لکھاری کی موجودگی اس کو دوام بخشتی ہے تذکرہ نویسی نظریہ / سیرت نگاری نظریہ (Biographical Theory)جیسا کہ کہتا ہے کہ لکھت کو لکھاری کی زندگی کے مطالعے کے بغیر بہتر یا مکمل معنی نہیں دیے جاسکتے تو اس سے لکھاری کی زندگی روانی میں آجاتی ہے اور لکھاری امر ہو جاتا ہے جیسا کہ جون ڈن(John Donne)موت کا للکارتا ہے کہ وہ اس فنا نہیں کر سکتی۔

Death, be not proud, thought some have called thee Mighty and dreadful, for than are not so Fort these whom thou think' st thou dost overthrow Die not, poor Death, nor yet east thou kill(4)

(ترجمہ): فنا/موت مغرور مت ہو بے شک چند تمہیں طاقت ور اور خوف ناک بلاتے ہیں اگرچہ تم ایسی نہیں ہو ۔اگرچہ وہ جن کا تم سوچتی ہو تم نے انہیں گرا دیا۔ گھبراؤ مت، بیچاری فنا، تم نے ابھی تک مجھے قتل نہیں کیا۔

یوں تو مستنصر حسین تارڑ کے تمام ناولوں میں علامتوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ مگر "ڈاکیا اور جولاہا" مکمل علامتی کہانی ہے۔ اس میں پیش کردہ کردار، ڈاکیہ محمد علی، جولاہا پوسٹ ماسٹر، رودین، نتالیہ چاروں علامتی ہیں۔ بدخشانی گھوڑا جوہر کارے (محمد علی) کی سواری ہے، سیف کبوتر جو آستانہ رومی کے باسی ہیں نتالیہ کے گلے میں لٹکا صلیب نما لاکٹ یہ بھی علامت کے طور پر مذکور ہیں۔

جولاہا وہ تخلیق کار ہے جو کھڈی پر ایک ایسے کھیس کی بُنت میں مصروف ہے۔ یوں تو ان کے تمام ناولوں میں علامتوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ فن کاری اور تخلیق کاری کا شاہ کار اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کرہ ارض پر ہنر مند، کاریگر اور دانش مند انسانیت کی معراج ہیں۔ تارڑ نے جولاہے کا سماج میں الگ تھلگ رہ کر اپنے کام میں مگن رہنے کو تخلیق کار کے وصف کے طور پر جانا ہے۔ جولاہا کے نام خط نے یہ کھیس بننے پر اسے مجبور کیا اسی طرح ناول نگار کے نام بھیجا گیا خط بھی اس سے یہ ناول لکھوا رہا ہے۔ جہاں سے خط آتے ہیں وہ پوسٹ آفس ہے۔ ڈاک خانہ گویا فن وبقا کا گھر ہے۔ جہاں پوسٹ ماسٹر (خدا) اپنی مخلوق کے نام خطوط بھیجتا ہے۔ "ہر شخص کی زندگی میں ایک خط ہوتا ہے کسی کو وہ مل جاتا ہے اور کسی کو نہیں ملتا۔ جس کو وہ مل جاتا ہے وہ اپنے آپے میں نہیں رہتا تھیا تھیا ناچنے لگتا ہے۔ اناء الحق کے نعرے لگاتا دار کی جانب چلنے لگتا ہے۔ کوچہ کوچہ کوبہ کو بھٹکتا ایک اندھے کنویں میں دفن ہو جاتا ہے۔ عشق کے ہاتھی تلے بخوشی روندا جاتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے اور جس کو یہ خط نہیں ملتا وہ شکوک اور تذبذب کی دلدل میں حیات گزار دیتا ہے"۔(5)
ڈاکیا کا کردار بھی علامتی ہے۔ خط کوئی کاغذی وجود نہیں رکھتے۔ وہ صرف الہام، خواب اور خیال کی صورت آتے ہیں اور مکتوب الیہ میں سے چند اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تو پھر پیغام بر کیوں کر مرئی ہو سکتا ہے تو گویا یہ کوئی فرشتہ ہے، کوئی روح ہے، کیا ہے؟ اس ڈاکیے کے بس میں فقط بھیجنے والے کے پیغام کو من وعن اپنے مقررہ وقت ومقام پر پہنچا دینا ہے۔ ناول میں موجود خود کلامی اور مکالمے قاری کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات بھی مہیا کر دیتے ہیں۔

"(محمد علی ڈاکیا)۔ کبھی تو وہ ایک جلتی ہوئی جھاڑی کی قربت میں نظر آتا ہے اور اس کا گھوڑا کوہ طور کے پتھروں

پر بے آواز چلتا آتا ہے۔ کبھی وہ ایک صلیب کے سامنے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ڈاکیا کسی اندھے کنویں میں جھانک کر یوسف کو بھی تلاش کرتا ہے۔۔۔اس نے عین وقت پر پہنچ کر اسماعیل کی گردن پر رکھی چھری کو ہٹایا تھا۔ کبھی وہ غار حرا کے آس پاس منڈلاتا ہے"۔(6)

ڈاکیا جہاں فن کی تخلیق کا سبب بنتا ہے اور ناول کے ابتدائی حصہ میں تخلیق کے فن پر سیر حاصل بحث ہے، اس کا مرکزی کردار ہے۔ وہیں وہ ناول کے مکاتیبی (Epistolary)طرز تحریر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مکاتیبی طرز تحریر سے مراد خطوں کے ذریعے بات کا قاری تک پہچانے کا طریقہ ہے جو کہ مغربی ناول کی ابتدائی زمانے کی مشہور صنف ہے جس میں فیلیڈنگ (Fielding)اور رچرڈسن (Richardson)کے نام قابل ذکر ہیں۔ اردو میں عزیز احمد اور قاضی عبدالغفار نے مکاتیبی ناول میں تجربہ کیا۔ مذکورہ ناول اگرچہ مکمل طور پر ایک مکاتیبی ناول نہیں۔ مگر ناول کا ایک بڑا حصہ خطوط پر مشتمل ہے، جس کا نتالیہ کے نام سے ایک باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان اپنی کتاب "ادبی اصطلاحات" میں مکاتیبی ناول کی یہ تعریف کرتے ہیں:

"ناول جسے اس طرح لکھا جائے کہ وہ دو یا دو سے زیادہ افراد کے مابین خط و کتابت پر مشتمل ہو۔ ناول نگار بظاہر اپنی طرف سے کچھ نہ کہے۔ اس قسم کا ناول لکھنا خاصا دشوار ہے کیونکہ ناول نگار خود پر بہت سی پابندیاں عائد کر لیتا ہے۔ ناول کو خواندنی بنانے میں بھی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"(7)

نتالیہ کے خطوط رودین کے نام سے ناول کے پلاٹ کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے انہیں خطوط سے نتالیہ کے کردار کا ارتقائی مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اُس سے پہلے وہ ایک گاؤں کی سید فیملی کی ایک لا اُبالی سی لڑکی ہے مگر خطوط کی روانی اور اسلوب سے ایک لکھاری کا سفر شروع کرتی ہے۔ جبکہ رودین کا کردار مکمل طور پر مغلوب ہے، بالکل "قربت مرگ میں محبت" کے خاور کی طرح جو کہ ناول کے چار نسوانی کرداروں میں خود کو گھرا ہوا محسوس کرتا ہے اور وہ نسوانی کردار اس کے کردار کو اپنی مرضی سے مختلف سمتیں دیتے نظر آتے ہیں۔ رودین بھی خاور کی طرح نتالیہ جیسے مضبوط کردار کے سامنے کافی بونا لگتا ہے۔ نتالیہ کے کردار کو بہت بڑا دکھایا گیا ہے بلکہ سارے پلاٹ میں نتالیہ ہی موجود ہے جو باقی تمام کرداروں کو مصلوب کر دیتا ہے اور سب کچھ اسی حوالے سے وقوع پذیر ہوتا ہے جیسا کہ ابسن کا شہرہ آفاق ڈرامہ "ہیڈا گیبلر" (Hedda Gabler) ہے۔ جس میں "ہیڈا" کا کردار باقی تمام کرداروں کو مصلوب کر دیتا ہے اور سب کچھ اسی حوالے سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ابسن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ایک فنکار کی صورت ایک نوجوان خاتون کی صورت میں ہے۔ یہی کچھ مستنصر حسین تارڑ کے بارے میں بھی کہنا غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ "قربت مرگ میں محبت" اور "ڈاکیا اور جولاہا" کی طرح

باقی ناولوں میں بھی نسوانی کرداوں کو جس عمدگی سے بیان کرنے کے ساتھ ان کو مرکزیت اور طاقت عطا کی ہے وہ نسوانی نظریہ کی غمازی کرتی ہے۔

مذکورہ ناول میں ڈاکیا اور جولاہا دونوں مذکر نام استعمال ہوئے ہیں۔ جبکہ اُس کے برعکس پورے ناول میں نتالیہ جو کہ ایک نسوانی کردار ہے، مکمل طور پر چھائی ہوئی ہے۔ نتالیہ کے کردار کا ارتقاء پہلے پہل اُس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جس میں وہ اپنی زندگی کی کتھا رودین کو سناتی ہے جو کہ ادھیڑ عمر شخص ہے اور لکھاری ہے۔ نتالیہ جس نے ایک ناول لکھا ہے اور اسی کے بارے میں اصلاح لینا چاہتی ہے۔ اپنی تمام تر خاندانی روایات اور پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رودین کو خط لکھتی ہے لیکن یہ ایک خط مستقبل میں بے شمار خطوط کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور رشتے اپنی جڑیں مضبوط کرتے چلے جاتے ہیں اور ایک ان دیکھی افسانوی محبت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اپنی عمر کے آخری دن نتالیہ اپنی فیملی کو چھوڑ کر رودین کے پاس آجاتی ہے بالکل اُسی طرح جس طرح غلافی آنکھوں والی پاگل خانہ کا بھی نام صیغہ راز میں رکھا گیا اُسی طرح جسطرح ڈاکیا اور جولاہا کی سیدزادی کو نتالیہ کا نام دے دیا گیا۔ دونوں ناولوں میں مرد مصنف ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو جیسا کہ جولاہے کا ایک دھاگا اپنا ہے تو کہیں مستنصر حسین تارڑ بھی خود اپنی سوانح عمری کو ان دونوں فن پاروں میں ضرور شامل کر رہے ہیں۔ اسی بات کا اشارہ غفور احمد نے ان الفاظ میں دیا ہے:

”ان فن پاروں کو جنسی اور نفسیاتی حوالوں سے دیکھ کر بہت سے ایسے عوامل کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو نسوانی پہلو اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ایک ادیب اپنی کہانی اور اپنے کردار آس پاس کی زندگی سے مستعار لیتا ہے۔ اپنی زندگی کے بہت سے تجربات کو فکشن کے پیرائے میں سمو دیتا ہے۔“(8)

ہر ناول ہی اپنے اندر کچھ نہ کچھ سوانحی پہلو ضرور رکھتا ہے مگر یہ مقصد نہیں کہ لکھاری کی زندگی کو کربرا کہا جائے بلکہ لکھت، لکھاری سے جدا بھی ایک سچائی ہے جس کے اپنے کردار اپنے حصے کی زندگی ایک اور ڈھنگ سے جیتے ہیں جو کہ معاشرے میں موجود لوگوں کی عکاسی ہوتی ہے۔ سوانح عمری کے جھنجھنٹ سے ایک نتالیہ کا کردار اپنے آپ میں ایک نفسیاتی کیس سٹڈی ہے۔ نتالیہ نام ہی روسی ادب سے مستعار لیا گیا ہے جو کہ سیدزادی کا کردار ہے اس کے ساتھ ساتھ نتالیہ کی شخصیت پر جہاں خانقاہی ماحول کی چھاپ ہے وہیں کانونٹ کی تعلیم اُس کو روشن خیال اور تھوڑا باغی بنادیتی ہے۔ یہی روشن خیالی ہے جس کے سبب وہ رودین کو خطوط لکھتی ہے اور پھر اُس سے اپنی ذاتی سے ذاتی زندگی بھی بانٹتی چلی جاتی ہے۔ نتالیہ رودین سے ایک خط میں یہ اعتراف کرتی ہے:

"آپ شاید ہنسیں میں سوچتی ہوں کہ اگر مجھ میں حوصلہ ہوتا اور حق حاصل ہوتا تو محض یہ روایت توڑنے کے لیے کہ "غیر سید" ہمارے خاندان میں شامل نہیں ہو سکتا کسی غیر سید سے ہی نہیں غیر قوم کے فرد سے شادی کر ڈالتی چاہے وہ کوئی نیگرو یا افریقی ہی کیوں نہ ہوتا۔"(9)

نتالیہ شادی شدہ ہونے اور بچوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ ایک اپنی سے بڑی عمر کے شخص کے عشق میں مبتلا ہے ۔وہ سب کچھ چھوڑ کر ان دیکھی قوت کے زیر اثر کھچی کھچی امریکہ سے پاکستان واپس آجاتی ہے۔ یہ مرکزی کردار عشق کے منہ زور ہاتھی تلے روندی جاتی ہے۔رودین کے پردے میں یہ عاشق اپنے حقیقی محبوب کے عکس دیکھ لیتی ہے چناں چہ وہ اپنی پوری زندگی کے حاصل کو داؤ پر لگا دیتی ہے۔ ممتاز احمد خان نے اس کردار کے بارے میں لکھا ہے :

"گرنے سے قبل وہ خدا کے متعلق جاننا چاہتی ہے۔ آشانہ رومی کے بابا کی یہ نادیدہ عشق میں مبتلا عورت جو گلے میں صلیب لٹکائے رہتی ہے نہ معلوم کس بھید کو جاننا چاہتی ہے"۔(10)

نتالیہ عشق اور جستجو کا سمبل ہے۔اس کے گلے میں صلیب، منصور کا نعرہ اناء الحق اور کربلا اس کی خواہشات اور ارادوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ محبوب کی خاطر اس کے وصل کی قیمت کے طور پر سر دھڑ کی بازی سے گریز نہیں کرتی یہاں علامت کو ہٹا کر محض اکہری نظر سے خواندگی ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ نتالیہ کا اپنے شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر بوڑھے آدمی کے پاس آجانا بے وفائی، ہوس پرستی اور خود غرضی ہے مگر جب اس عورت کو علامت کے طور پر سامنے رکھیں تو نتائج مختلف نکلتے ہیں۔ نتالیہ میں یہ باغیانہ روح کہیں اچانک سے وارد نہیں ہوتی بلکہ اس سب میں لینن اور مسولینی کے نظریات کے ساتھ ساتھ روسی ادب کے اثرات کی وجہ سے اس سوچ میں انقلابی پن آگیا ہے۔ نتالیہ کا کزن سوان جو کہ تعلیم کی غرض سے روس گیا ہوا ہے۔ وہاں سے اُس کے لیے روسی ادب کی کتابیں گاہے بگاہے بھیجتا رہتا ہے۔ نتالیہ کو خود بھی پڑھنے کا شوق ہے جس کی وجہ سے وہ ادب کا مطالعہ کرتی رہتی ہے۔ کانونٹ کی تعلیم کے ساتھ مختلف عوامل مل کر ایک عام سی سید زادی کو نتالیہ بنا دیتے ہیں جو کہ ایک ناول لکھ ڈالتی ہے۔ جس کے بعد اُس کو اُس ناول کے شائع ہونے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے مگر اس سے پہلے وہ رودین سے اُس ناول کے مسودے پر ایک علمی تنقیدی رائے چاہتی ہے جس کی روشنی میں وہ ناول کو مزید تبدیل یا بہتر بنا سکے ادب جہاں دو لوگوں کو ملوانے کا سبب بنتا ہے، وہیں ان کے رشتے کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ وہ دنیا جہان کی باتیں ایک دوسرے سے کرنے لگ جاتے ہیں اور ایک الگ تخیلاتی و تصوراتی دنیا قائم کر لیتے ہیں جہاں

وہ اپنی معاشرتی پہچان کو پیچھے چھوڑ کر کچھ وقت کے لیے روسی ادب کے دو کردار رودین اور نتالیہ کا روپ دھا رلیتے ہیں۔
رودین کا کردار ایک دیومالائی حیثیت کا حامل ہے۔ نتالیہ اور اس کے درمیان خط وکتابت سے اس کے جوہر سامنے آتے ہیں۔ یہ کرداروسی ناول رودین کے مرکزی کردار جس کا نام بھی رودین ہے سے مشابہہ ہے (بقول نتالیہ) جو اپنی باتوں، اپنی علمی دھاک، اپنی قابلیت اور دل نشین گفت گو کے باعث ایک لڑکی کو گھائل کرتا ہے۔ نتالیہ رودین کی شخصیت کے سحر میں ایسے گرفتار ہوئی کہ وہ اپنے آپ میں نہ رہی، یہاں رودین مردانہ وجاہت نہیں بلکہ علمی وادبی حیثیت کا حامل کردار ہے۔ یہ تخلیقی ذہن ہے جو بہر حال خالق کی خاص عطا کی بدولت تمام انسانوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ پوسٹ ماسٹر وہ تقدیر کنندہ ہے جو مخلوق کی قسمتوں کے فیصلے لکھتا ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جو سب جہانوں پر قادر ہے۔ ہرکارے کو بھیجنے والا یہ کون ہے ناول کے اندر موصول کنندہ نے یہی سوال ڈاکیا سے کیا تو اس نے یہ جواب دیا

"وہی جس کے ہاتھ میں مہر ہے، جو بڑے پوسٹ آفس میں بیٹھے ہیں ان کا کام ہی یہ ہے ایسے خطوں پر مہر لگانا، میں تو ہرکارہ ہوں ،میں نہیں مگر پوسٹ ماسٹر صاحب جانتے ہیں، وہ سب جانتے ہیں"۔ (11)
نتالیہ اور رودین کی یہ تخیلاتی دنیا مکاتیب کی شکل میں ناول کے ایک بڑے حصے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ان مکاتیب میں نتالیہ زیادہ تر اپنی ذات کی تشریح کرتی رہتی ہے اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو بیان کرتی ہے اور ایک نوجوان لڑکی کے احساسات اور جذبات کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ ابتدائی مکاتیب سوان، نتالیہ کی ادب کو لے کر دلچسپی اور خانقاہی نظام کے بیانیے پر مشتمل ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اور خط کی شکل میں آدھی ملاقاتوں کے زیر اثر نتالیہ میں رودین کو لے کر محبت کا جذبہ سر اٹھانے لگتا ہے۔ وہ محبت جو اُس کے خاندان میں گناہ ہے جس کی اجازت مشکل تو کیا ناممکن ہے۔ جس رودین کی محبت اس کے دل میں جگہ بنائے بیٹھی ہے، اس نتالیہ کو خط کا لکھنا ہی ایک غلطی لگتا ہے۔ وہ اپنی روایات اور حدود کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسا کرتی ہے جس کا اُس کو خود بھی احساس ہے جس کو وہ ان الفاظ میں تسلیم کرتی ہے:
"میرا ماحول تو ایسا ہے کہ مجھے آپ کو خط ہی نہیں لکھنا چاہیے تھا، شاید غلطی کر رہی ہوں، شاید مرے اندر کوئی بری لڑکی چھپی بیٹھی ہے، شاید لکھنا ہمارے خاندان میں غلط کام ہے۔ بہر حال میں کچھ کرنا ضرور چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے ادب میں۔"(12)

نتالیہ ادب میں کچھ کرنے کی غرض سے رودین سے رابطہ قائم کرتی ہے مگر جس گھرانے کی وہ فرد ہے اُس میں تو سرے سے لکھنا پڑھنا ہی غلط ہے۔ ان تمام روایات کی پاس داری نہ کرتے ہوئے وہ بغاوت کرتی ہے مگر وہ بے بس ہے۔ وہ اپنے کزن بھائی سوان سے امید رکھتی ہے کہ شاید وہ روس کی تعلیم کی بنا پر نئے نظریات سے اس نظام میں کوئی تبدیلی ضرور لائے گا اور اس سب کو ختم کر دے گا جو کہ فرسودہ ہے۔ نتالیہ خانقاہی ماحول اور فرسودہ نظام سے تنگ ہے بابا جی کو وہ بہت پسند کرتی ہے مگر ان کے علاوہ باقی کچھ اُسے بہتر نہیں لگتا اور ایک بابا جی ہی ہیں جو کہ اس کو سمجھتے ہیں۔ بابا جی ہی اُس کی تلاش اور تجسس کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔ با با جی ہی اس کو پرندے ڈھونڈنے کا کہتے ہیں۔ نتالیہ بابا جی سے مکمل طور پر متاثر ہے مگر بابا جی کے علاوہ باقی تمام ماحول سے وہ باغی ہے اس کے اندر ایک لاوا ابل رہا ہوتا ہے لیکن اس کا کوئی بس نہیں چلتا۔ اس سب میں کانونٹ کی تعلیمی ایام میں عیسائیت سے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے وہ گلے میں ایک صلیب بھی لٹکا لیتی ہے اور حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے مجسموں کے گرد اُس کو گھومنا اچھا لگتا ہے نتالیہ کا کردار اتنا سادہ نہیں وہ ایک متجسس روح کے طور پر دکھائی گئی ہے جو کہ سچ کی تلاش میں ہے۔ وہ سچ جسے وہ گھر اور ارد گرد کے ماحول کے بعد آستانہ رومی میں ڈھونڈتی ہے اس کے بعد کانونٹ کی دیواریں پھلانگ کر متصل چرچ میں جاتی ہے کیونکہ وہ کچھ جاننا چاہتی ہے اس سب کے بعد وہ ادب میں آکر پناہ لیتی ہے وہ خط میں رودین کو لکھتی ہے کہ سکول کے باغ کی ایک دیوار ٹاپ کر ہم ملحق چرچ میں جاسکتے تھے وہاں چھپ کر اندر چوروں کی طرح دبے پاؤں چپ چاپ حضرف عیسیٰ کے بڑے بڑے مجسموں کے درمیاں گھومتے رہنا مجھے بہت پسند تھا۔ ادب کے وسیلے سے وہ رودین تک پہنچتی ہے اور پھر بات یہی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ نتالیہ کو رودین کے ساتھ جذباتی لگاؤ ہو جاتا ہے۔ مگر ایسا کچھ ممکنات میں سے نہیں۔ اس ساری صورتحال کو غفور احمد نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”جذبات کا یہ اظہار، اظہار عشق میں بدل جاتا ہے۔ مخالف فریق ایک شادی شدہ اور ادھیڑ عمر کا شخص ہے اس ساری تفصیل سے باخبر ہونے کے باوجود وہ بقول تارڑ عشق کے ہاتھی تلے روندی جاتی ہے عشق کا سیندوری ہاتھی بہت پوش پوش کرتا ہے لیکن جنھوں نے اس کے نیچے آنا ہے وہ اس اعلان کو ایک دعوت نامہ سمجھتے ہیں۔ ذہنی اور جذباتی طور پر اس تبدیلی کے باوجود اسے معلوم ہے اس خانقاہ کی دیواریں بہت اونچی ہیں اس کی تعلیم اور اس کا مطالعہ اس نئے جہاں کی آبادکاری پر اکستا ہے لیکن وہ جس ماحول کی پروردہ ہے وہاں کی روایات بہت فرسودہ لگی بندھی ہیں اور یہ کچھ ممکن نہیں ہے(13)

نتالیہ کا دادا آستانہ رومی کا سجادہ نشین بھی ایک علامتی کردار ہے جو اپنی وضع میں مکمل صوفی اور بھگتی ہے روایتی گدی چلاتے ہوئے بھی وہ اپنی پوتی کو کانونٹ سکول میں بھجواتا ہے۔ ارتداد شک، بدعقیدگی اور مذہب سے برگشتگی، صلیب کو لیے پھرنا کسی بھی چیز پر بابا معترض نہ تھے۔ نتالیہ کہتی بابا میری تلاش حق کی جستجو ختم نہیں ہوئی تو ان کا جواب تھا:

"تلاش اگر ختم ہو جائے اور وہ مل بھی جائے جو نظر نہیں آتا پھر بھی شک باقی رہتا ہے۔ شرک زور پکڑتا ہے اس لیے یہ تیری خوش بختی ہے کہ تیری تلاش اختتام کو نہیں پہنچی تو میری داڑھی میں وہ پرندے تلاش کر جو وہاں نہیں ہیں"۔(14)

یہ روایتی درگاہ کی بجائے حقیقی روحانی آستانہ کے فقیر ہیں جو تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے کوسوں دور ہیں۔ جو انسان کو آزاد چھوڑ کر اسے تلاش کا لپکا لگانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جو فقط محبت کے ذریعے تمام عالم کو فتح کرنے کا درس دیتے ہیں۔

امریکہ میں بسنے والا نتالیہ کا شوہر ناصر ان لوگوں کا نمائندہ ہے جو اپنی مادی آسائش کے سلئے وطن، مذہب ،روایات، خاندان سب کچھ تیاگنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ مادیت کا نمائندہ اور علامت ہے۔ نتالیہ جب کینسر وارڈ میں پڑی تھی تب وہ نئے گھر کو خریدنے کی پلاننگ کر رہا۔ نتالیہ اپنی تمام تر باغیانہ سوچ کے باوجود اسی فرسودہ نظام کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ نتالیہ کا کردار معاشرے میں موجود ذات پات کے نظام کا آئینہ دار ہے جس میں لوگ قید ہیں ذات پات اونچ نیچ کے اس صدیوں سے چلتے نظام کو لوگ اور معاشرہ جوں کا توں لیے ہوئے ہے آج بھی انسان کی انفرادی جذباتی روش کو اسی فرسودہ نظام کی قید سے فرار حاصل نہیں ہے نتالیہ آج کی لڑکی کی نمائندہ بھی ہے جو کہ ترقی یافتہ دور میں جب دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے اُس کے باوجود برادری اور ذات پات کے قید خانے میں موجود ہے نتالیہ کا کردار اپنے اندر بہت سے معنی لیے ہوئے ہے۔ نتالیہ جہاں طبقاتی تقسیم کے پہلو کو آشکار کرتی ہے وہیں جوان لڑکی کے جذبات پیش کرتی ہے جو کہ نفسیاتی مطالعہ کے لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔

علم نفسیات کے حوالے سے اگر نتالیہ کے کردار کو پرکھا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ نتالیہ نرگسی شخصی بیماری کا شکار ہے۔ وہ جس ماحول کی پیداوار ہے، وہاں پر ایسا شخصی روپ ایک قدرتی امر بن جاتا ہے۔ ایک سید زادی ہونے کی وجہ کر کے معاشرے میں اُس کی اہمیت ہے لوگ اس سے عقیدت اور محبت کا سلوک کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود لکھتی ہے کہ اُس کے ہاتھوں سے لہسن اور ادرک کی بو نہیں جاتی۔ کیونکہ مختلف خواتین عقیدت اور محبت سے اُس کے ہاتھ چومتی اور پیر دباتی ہیں۔ نتالیہ کو ایک روایتی سید زادی کے روپ میں دکھایا گیا ہے جس کے سامنے لوگ جھکتے اور نذرانے دینے آتے ہیں۔ لوگ دعا کروانے آتے ہیں کہ ان کے دکھ اُس کے دعا کرنے سے ٹل جائیں گے۔ اس قدر عقیدت سے ایک احساس برتری شخصیت میں ضرور گھر کر لیتا ہے اور یہی احساس برتری (Superiority Complex) آگے چل کر نرگسی شخصی بیماری (Narcissistic Personality Disorder) کا روپ دھار لیتا ہے۔ نرگسیت (Narcissism) میں انسان اپنے آپ سے محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خود کو دوسروں سے اعلیٰ اور افضل گردانتا ہے۔ خود کو دوسروں کے لیے اہم سمجھتا ہے اور ایک طرح کی خود پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس نفسیاتی بیماری کا نام بھی یونانی دیوتا نارسیس کے نام پر ہے جو کہ اپنے عکس کو پانی میں دیکھتے دیکھتے تالاب میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ نتالیہ کے کردار میں اس قسم کے پہلو نظر آتے ہیں۔ نتالیہ بھی خود سے محبت کرتی ہے اور ایک طرح کی خود پرستی کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے نتالیہ ایک جگہ لکھتی ہے کہ میں سوچتی ہوں کہ میں نے یوں خود کو سنبھال سنبھال کر سنوار کر رکھا ہے تو بس محض اس ایک عام سے انسان کے لیے۔ شاید باجی ٹھیک کہتی ہیں کہ تجھے یہ احساس اور نخرہ ہے کہ تو بہت سوہنی ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی کہ وہ خود کو خوبصورت گردانتی ہے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر خود کو سمجھتی ہے جس کی وجہ بھی خود جانتی ہے کہ ایک خط میں رودین کو اپنے اس رویے کے بارے میں یہ لکھتی ہے:

"جیسا کہ ایک مرتبہ آپ نے بھی تحریر کیا تھا کہ یہ میری موروثی مجبوریاں اور پابندیاں ہیں اور ان سے وابستہ وہ تمام عقیدت وتقدس احترام وپاکیزگی کے تصورات جو بچپن ہی سے مجھے اپنے اردگرد نظر آئے ہیں اور میری منفرد پسندی کے لیے بڑے مسرت وتفاخر بخش تھے اس درجے کہ یقین کریں میں شاید اپنے آپ کو کوئی شہزادی نہیں بلکہ دیوی سمجھتی تھی جس کے صرف قدموں کو چھونے کے لیے سب بنے ہوں اس سے آگے رسائی کے کوئی قابل نہ ہو اور شاید۔۔۔"(16)

اپنے آپ کو دیوی سمجھنے والی نتالیہ آخر کار خاندانی روایات کی بھینٹ چڑھ گئی اور اُسے ناصر بخاری سے شادی کرنی پڑ گئی جس کے ہمراہ اُس نے اپنے ملک پاکستان کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ناصر بخاری کے ساتھ وہ اردن جاتی ہے

جہاں پر وہ تین سال کا عرصہ گزراتے ہیں اس کے بعد وہ امریکہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے۔ رودین کی نتالیہ امریکہ پہنچ کر بھی اپنے رودین کو اپنے ذہن سے نہیں جھٹک پاتی مگر کہانی نئے موڑ لینا شروع کر دیتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ جہاں اس ناول میں فن اور فن کی تخلیق پر بات کرتے ہیں وہیں نتالیہ جیسے مضبوط نسوانی کردار کی نفسیاتی کشمکشوں کو بیان کرتے کرتے تاریک وطن لوگوں (Migrated People)کے مسائل کو بھی بیاں کرتے ہیں۔ نتالیہ امریکہ جا کر بھی اپنی روایات کی پاسدار رہتی ہے وہ نتالیہ جو کہ ایک باغی ہے جو کہ اپنی روایات سے بغاوت کرنا چاہتی تھی جو کہ رودین کو سب کچھ مانتی تھی جو کہ اس کے لیے اپنے سماج سے ٹکرانے کی جرت رکھتی تھی۔ اسے جب موقع ملتا ہے وہ امریکہ ہے وہ زندگی کو امریکی انداز میں گزار سکتی ہے اپنی روایات کو فراموش کر سکتی ہے جبکہ اس کا خاوند ناصر بخاری بھی اس حق میں ہے مگر وہ اپنی ثقافت اور اخلاقیات کا پہلو نہیں چھوڑتی لیکن ناصر بخاری جو کہ قدامت پسند انسان تھا امریکہ پہنچ کر یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ اپنی روایات اور اخلاقیات کو بھلا دیتا ہے۔ وہ امریکی طرز زندگی کو اپنے اوپر سوار کر لیتا ہے اور دوڑ کا حصہ بن جاتا ہے اس جدوجہد میں وہ اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کو بھی بھلا بیٹھا ہے جسکی بدولت بچے بھی امریکہ کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ ناصر بخاری مکمل طور پر امریکہ کو اپنا چکا تھا جیسا کہ ناول میں درج ہے۔

"اس معاشرے میں اگر مستقل قیام ہے تو پھر اسی رنگ میں رنگا جانا کامیابی اور آسائش کے لیے پہلی شرط ہے ۔۔۔ یہاں آستانہ رومی کی اخلاقیات اور تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہ تھی۔۔۔ چنانچہ وہ بہت آگے چلا گیا۔۔۔ یہاں تک کہ اس کے گھر میں منعقد کردہ پارٹیوں میں پاکستانیوں کی تعداد کم سے کم ہوتی کہ وہ ان سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔۔۔ وہ ان کے مذہب اور لباس کے بارے میں قدامت پسندی کو نظر حقارت سے دیکھتا اور امریکی دوستوں کے ساتھ مل کر ان کی۔۔۔ اپنے وطن، مذہب، ثقافت، لباس اور کھانوں سے جڑے رہنے کی کوشش کا مذاق اڑاتا۔۔۔"(17)

نتالیہ بہت کچھ برداشت کرتی ہے وہ امریکہ وہ اپنے بچوں کو بہتر راستے پر رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے مگر بری طرح ناکام ہوتی ہے کیونکہ ناصر بخاری اس کا ساتھ دینے پر تیار نہیں ہے وہ مکمل طور پر امریکی ہو جانے کا قائل ہے۔ اس نے اپنے ماضی سے رابطہ منقطع کر لیا ہے اب اس کا مسکن فقط امریکہ ہے اس سب کے درمیاں نتالیہ سب کچھ کا تماشہ خاموشی سے دیکھ رہی ہے کیونکہ وہ کچھ بھی کرنے کی حالت میں نہ ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے امریکی معاشرے کی جنسی بے راہ روی کے پہلو کو آشکار کیا ہے جو کہ اس معاشرے کے خمیر کا ایک

حصہ ہے جہاں امریکہ کو مواقعوں کی سرزمین کہا جاتا ہے جہاں معاشی خوشحالی موجود ہے وہیں اخلاقی بدحالی بھی اپنے زوروں پر ہے نتالیہ اپنی بیٹی زینب کے بارے میں بتاتی ہے کہ "آرلینڈو شہر۔۔۔ میں جتنے بھی گورے اور کالے، نوخیز یا عمر ڈھلتے تھے اس کی قربت کے لیے وحشی ہوتے جاتے تھے اور وہ انہی مایوس کرنا کفر سمجھتی تھی" جبکہ زینب کا بھائی داراشکوہ اپنی بہن کے عاشقوں کو قتل کرنے کے درپے نہ تھا" بلکہ الکوحل اور منشیات کے مرکب کی دھند میں گم دار انہایت فخر سے ڈنگیں مارتا تھا کہ مائی سسٹر زینب۔۔۔ وہاٹ اے گرل۔۔۔ ہول ٹاون از کریزی اباؤٹ ہر۔۔۔"(18)

نتالیہ کا امریکی زندگی کا تجربہ اور جب کینسر کی خبر سن کر ڈرنے کے بعد پاکستان آنے پر رودین کا پاکستانی زندگی کا تجربہ ایک کمال تقابل پیش کرتا ہے جیسا کہ مستنصر حسین تارڑ نے بیان کیا ہے۔ نتالیہ جس کو کینسر ہو جاتا ہے ۔ کینسر کو ہٹا بھی دیا جاتا ہے مگر نتالیہ کے دل میں ڈر بیٹھ جاتا ہے اور اس ڈر کی وجہ کر کے وہ رودین کو کال کرتی ہے اور اڑ کر پاکستان پہنچ جاتی ہے۔ وہ مقبرہ جہانگیر کے ہجوم میں ملتے ہیں ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں ایک دوسرے کو اپنا احوال سناتے ہیں۔ نتالیہ اپنی فیملی کے بارے میں بتاتی ہے:

"وہ گوروں سے زیادہ گورا ہونا چاہتا تھا۔۔۔ میری اولاد کی بے راہ روی۔۔۔ میں تو اسے بے راہروی ہی کہوں گی کیونکہ میں آستانہ رومی کی ایک گنوار اجڈ دیہاتن ہوں۔۔۔ اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔۔۔ وہ عیدین پر بھی چھٹی نہیں کرتا۔۔۔ لیکن ہیلوئین بڑے شوق اور جذبے سے مناتا ہے"(19)

"ہاں۔۔۔ میں ایک تنکا تھی جو ناصر بخاری اور بچوں کے تیز و تند ریلے میں بے بس بہتی تھی۔۔۔ تمہیں بتاؤں کہ ایک گے(Gay) بچے کی ماں ہونا۔۔۔ اس کے جننے کی اذیت سے کئی ہزار گنا بڑھ کر ہوتی ہے۔۔۔ دارا۔۔۔ میرا داراشکوہ۔۔۔ اپنے خاوند کے ساتھ رہتا ہے۔۔۔"(20)

تالیہ کے تقابل میں رودین کے بچے لائق اور فرمانبردار ہیں جو کہ اپنے بچوں کے ساتھ خوش ہیں اور باپ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ رودین بتاتا ہے۔

"ہر دوسرے روز بال بچوں سمیت آ دھمکنا۔۔۔ میرے لیے ہر وہ شے لے کر آنا جو پہلے ہی درجنوں کے حساب سے میرے پاس موجود ہے اور بار بار اصرار کرنا کہ ابو آپ باقاعدہ چیک اپ کرواتے رہے۔۔۔ میں آجاؤں گا۔۔۔ میں پہنچ جاؤں گی۔۔۔ یہ سب فکر مندیاں اور محبت کے اظہار مجھ پر بوجھ ڈالتے ہیں۔۔۔"(21)

نتالیہ اور رودین دو متضاد محل وقوع میں رہے۔ ان کے بچے بھی مختلف ماحول کی پیداوار ہیں چنانچہ ان کے رویوں بھی اچھا خاصا فرق صاف ظاہر ہے۔ یہ تقابلی جائزہ ناول کو مختلف رخ دیتا ہے اور اس کو نو آبادیاتی ادب کی

فہرست میں لا کھڑا کرتا ہے۔ناول کی ابتداء سے جہاں یہ فن کی تخلیق پر فلسفانہ بحث تھی، اس کے بعد مکاتیبی ناول کی شکل اختیار کی۔اس کے بعد نو آبادیاتی ناول کے روپ میں آگیا اسی طرح جس طرح جولاہا سوت کاتتے کاتتے کھیس کو مختلف ڈیزائن اور رنگ دیتا چلا جاتا ہے۔نو آبادیاتی ادب بھی مہاجرین کے مسائل اور دوسرے معاشرے میں شناخت سے ہمکنار ہو کر پاکستان لوٹتا ناول کی نو آبادیاتی دائرہ کار متعین کرتا ہے۔ نتالیہ امریکہ میں اپنی شناخت کھو بیٹھی ہے۔اس کا خاوند اور بچے اُس ماحول میں رنگ کر اس سے پرائے ہو جاتے ہیں۔وہ مکمل طور پر اکیلی ہو جاتی ہے۔وہ اپنی شناخت کھو بیٹھی ہے۔وہ مکمل طور پر اکیلی ہو جاتی ہے وہ اپنی شناخت کے بچاؤ کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔لیکن کینسر کا پتہ لگنے کے بعد وہ امریکہ کے ہاسٹل میں بغیر کسی شناخت کے مرنے کی بجائے رودین کے پاس پاکستان آنے کو فوقیت دیتی ہے۔ نتالیہ کا سید زادی ہونا اُس کی ایسی شناخت ہے جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کرتی اس کو تمام حدود اور اخلاقیات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نتالیہ میں نرگسیت پسندی کا عنصر بھی آخر تک قائم رہتا ہے نتالیہ جب پاکستان آنے کے بعد رودین کے پاس مستقل رہنے کا فیصلہ سناتی ہے اور وہ مخمصے میں آجاتا ہے تو نتالیہ غصے میں کہتی ہے:

"میں سوالی نہیں ہوں سید زادی ہوں یاد رکھو۔۔۔لوگ مجھ سے سوال کیا کرتے تھے۔۔۔میری انگلیوں میں سے ابھی تک لہسن اور پیاز کی بو نہیں گئی۔۔۔تم مجھ پر احسان نہ کرو۔۔۔"(22)

نتالیہ کا کردار بہت مضبوط ہے اور مسلسل ارتقاء میں ہے۔تمام دوسرے کردار نتالیہ کی زبانی یا اس کے حوالے سے ناول میں شامل ہیں کوئی کردار نتالیہ جتنا مکمل نہیں ہے اور نہ ہی کسی کا بیانیہ اتنا طویل ہے، جیسا کہ مستنصر حسین تارڑ نے نتالیہ کو کیا ہے رودین کا کردار نتالیہ کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔رودین کی نتالیہ کے بغیر کوئی شناخت نہیں۔پورے ناول میں فقط نتالیہ کی بات ہوئی ہے۔اُس کے نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے باقی تمام کردار ثانوی ہیں جیسا کہ رودین بھی کہتا ہے کہ:

"میں ایک فراموش کردہ کٹھ پتلی تھا۔۔۔ اپنی حیات میں ساکن تھا جب تم نے دھاگوں کو جنبش دی اور مجھے متحرک کر لیا۔۔۔طلب کر لیا"(23)

نتالیہ کے کردار کے بارے میں غفور احمد اپنی کتاب نئی صدی نئی ناول میں لکھتے ہیں:

"تارڑ کے ہاں مرد کرداروں کی نسبت نسوانی کردار ہمیشہ مضبوط اور زیادہ جاندار ہوتے ہیں۔اگر ان کے صرف اکیسویں صدی کے ناولوں کو دیکھا جائے تو ماسوائے قلعہ جنگی کے (وہاں کسی نسوانی کردار کا گزر ہیں نہیں ہے) سبھی ناولوں میں نسوانی کردار زیادہ توانا ہیں۔ چاہے وہ "قربت مرگ میں محبت" کی سلطانہ ہو یا عابدہ سومرو

"خس وخاشاک زمانے" کی شباہت ہویا "اے غزال شب" کی لیلیٰ اور جینا اسلام یا پھر زیر نظر ناول کی نتالیہ سبھی مرد کرداروں پر اپنے اعتماد اور فعالیت کے اعتبار سے فوقیت رکھتے ہیں"(24)

نتالیہ کے علاوہ اگر ناول کے مرد کرداروں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ وہ نتالیہ کے مقابلے میں بہت کمزور ہیں۔ رودین کی اپنی کوئی شناخت نہیں۔ رودین کے بارے میں بھی قاری کو نتالیہ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے اور ناول کے آخر میں وہ نتالیہ کو ملنے کی غرض سے مقبرہ جہانگیر میں ناول میں پہلی مرتبہ جسمانی طور پر موجود نظر آتا ہے۔ مگر اس کے بعد کے بھی تمام فیصلے نتالیہ کرتی ہے۔ وہ اپنے خاوند کو طلاق کا نوٹس بھیج چکی ہے اور اس نے رودین کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کو رودین مان لیتا ہے اور دونوں ایک ساتھ رہنے لگ جاتے ہیں۔ مصنف رودین کا مذاق بھی اڑاتا ہے کہ وہ صرف دھاڑنے والا شیر ہے جس سے رودین کے کردار کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے رودین کی شکل میں خاور کے کردار کو ہی دوبارہ پیش کیا ہے جیسا کہ "قربت مرگ میں محبت" میں خاور کے تمام افعال غلافی آنکھوں والی، عابدہ سومرو اور ڈاکٹر سلطانہ شاہ کے تابع رہتے ہیں اسی طرح رودین بھی نتالیہ کی تمام باتیں من وعن مانتا ہے۔ خاور کی طرح رودین بھی مصنف ہے اور دونوں کردار اپنے اپنے ناول میں ایک ہی جملہ "چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں"۔ مختلف جگہوں پر بولتے نظر آتے ہیں جس سے دونوں کرداروں کا ایک ہی ہونے کا شک پڑتا ہے "قربت مرگ میں محبت" میں غلافی آنکھوں والی کو بھی کینسر ہے اس کے بھی بچے اور خاوند ہے بالکل اسی طرح جس طرح نتالیہ کی صورتحال ہے اس تمام مماثلت سے یہ بھی لگتا ہے کہ شاید یہ خاور اور غلافی آنکھوں والی کی تفصیلی کہانی کا بیان ہے جو کہ نتالیہ اور رودین کی شکل میں کیا گیا ہے یا پھر مصنف کے لاشعور میں چلنے والی دو کہانیوں کی مماثلت کہیں لکھاری کی اپنی ذات میں موجود کچھ عناصر کی وجہ کر کے تو نہیں ہے۔ رودین کے ساتھ ایک اور مرد کردار سوان کا ہے جو کہ اہم کردار ہے سوان نتالیہ کا کزن ہے جو کہ ماسکو پڑھنے جاتا ہے۔ نتالیہ کے لیے روسی ادب کی کتابیں بھیجتا ہے۔ انقلابی ہو جاتا ہے نتالیہ کو یقین ہے کہ اس کا کزن اس ضعیف الاعتقاد معاشرے میں تبدیلی لائے گئے اور اپنے باپ "مٹھا سائیں" جن کا نام مٹھائی کھانے کی وجہ سے پڑا تھا۔ اس سے بہت مختلف انسان ثابت ہو گا۔ سوان ماسکو میں پڑھتے پڑھتے بہت بدل گیا تھا۔ وہ انقلاب پر یقین رکھتا تھا اور نتالیہ کو اس پر یقین تھا۔ اس لیے جب وہ رودین کے پاس پاکستان آتی ہے تو اس سے سوان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ رودین اور نتالیہ جب آستانہ رومی پر پہنچتے ہیں تو نتالیہ حیران رہ جاتی ہے کیونکہ سوان یکسر بدل چکا تھا۔

"ڈبہ کھول۔۔۔ڈبہ کھول۔۔۔"نووارد کے آس پاس لوگوں نے سرگوشی کی۔۔۔

نووارد گھبرا گیا مگر فوراً سنبھل گیا اور قدموں میں سے ڈبہ اٹھا کر اسے لرزتے ہاتھوں سے کھولا اور شاہ صاحب کے آگے کر دیا" مری حیاتی سنور جائے گی پیر جی۔۔۔ عاقبت سنور جائے گی۔۔۔ چکھ لیں۔۔۔ گوجر خان کی مٹھائی ہے"تب اس نے بھاری پپوٹے اٹھائے اور اسکی آنکھیں جیسے راتوں کو جاگنے والوں کی طرح نیم سرخ ہوتی ہے وہ پہلی بار کھولیں اور نتالیہ نے اس لمحے پہچان لیا۔۔۔ بابا کی داڑھی میں سوان کی آنکھیں جوں کی توں محفوظ تھیں۔۔۔

سوان نے کھلی آستین میں سے اپنا ہاتھ بڑھا کر یہ جانے بغیر کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے، ایک خوابناک حالت میں ہاتھ بڑھا کر ایک گلاب جامن اٹھایا اور اپنے منہ میں رکھ لیا۔۔۔(25)

سوان اپنے اصل یعنی مٹھا سائیں کی روش پر واپس ہو جاتا ہے۔ سوان کی تمام انقلابی سوچ اور نظریات مٹی کا ڈھیر ثابت ہوتے ہیں۔ سوان بھی اسی رنگ میں رنگا جاتا ہے جس میں مٹھا سائیں ہوتا ہے۔ تمام تر جذباتی فیصلوں اور نظریات کو یکسر بھول جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نتالیہ کی اس سے وابستہ تمام تر امیدیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اس طرح سوان کا کردار بھی نتالیہ کے سامنے بہت کمزور اور حقیر بن جاتا ہے۔ مٹھا سائیں اور سوان کا کردار دیہی زندگی میں شامل ضعیف الاعتقادی کے عنصر کی طرف بھی ایک واضح اشارہ ہے۔

"بابا" کا کردار سوان، مٹھا سائیں اور حتی کہ رودین سے بھی کہیں زیادہ کشش رکھتا ہے۔ نتالیہ اپنے بابا کی بیٹی ہے جو کہ مسلسل تلاش کے عمل میں ہے۔ بابا کو ناول میں ایک بزرگ ہستی کی شکل میں دکھایا گیا ہے جس سے نتالیہ بہت متاثر ہے کیونکہ ان میں روحانیت کا مادہ پایا جاتا ہے۔ بابا کو بھی نتالیہ کے اندر متلاشی روح کی بخوبی خبر ہے اسی وجہ کر کے وہ نتالیہ کو اپنی داڑھی میں موجود مزید پرندوں کی تلاش کا کہتے ہیں۔ نتالیہ کو ایک متجسس روح کے طور پر دکھایا گیا ہے اسی وجہ کر کے نتالیہ عیسائیت کی طرف بھی جھکتی ہے صلیب پہنتی ہے۔ پھر ادب کے ساتھ لگاؤ اور انقلابی سوچ بھی اسی کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ رودین کو خطوط اور جذباتی لگاؤ بھی اُسی تلاش کا حصہ ہیں۔

نتالیہ امریکہ رہ کر بھی اپنی اصل سے جڑی رہتی ہے اور اس کے کردار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ اپنے طور پر اپنے بچوں اور خاوند کو امریکی دنیا میں گم ہونے سے بچانے کی سعی بھی کرتی ہے لیکن اپنی شناخت کی بقاء کی خاطر واپس آجاتی ہے۔ نتالیہ کی تلاش اس کو محبت سے قریب تر کر دیتی ہے اور یہیں پر وہ اسرار کو سمجھنے لگ جاتی ہے۔ وہ جو پرندوں کی تلاش میں سفر کا آغاز ہوا تھا وہ منزل کے قریب آن پہنچتا ہے۔ نتالیہ کہتی ہے۔

"منصور کا انا الحق یہی تھا۔۔۔ میں نے اس کے ترجمہ شدہ خطوط پڑھنے ہیں جو امریکہ میں روحانیت کی تلاش میں بھٹکتے، کبھی گورور جنبش اور کبھی مولانا روم کے کلام میں پناہ لینے والوں میں بے حد مقبول ہیں۔۔۔ اس کے خطوط پڑھ کر اس کا "میں ہی حق ہوں" پر یقین رکھنا قریب از قیاس لگتا ہے رودین۔۔۔ اگر اس نے مجھے بنایا ہے، بھیجا ہے اور تخلیق کیا ہے اور مجھ میں وہ دانش پھونکی ہے جو مجھے ایک صلیب پہنا دیتی ہے، ایک رودین کے لیے زندگی وقف کر دینے یا شاید ضائع کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے تو یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔۔۔ اگر وہی کوزہ گر ہے تو کوزے کو کیا اختیار کہ وہ کونسی شکل اختیار کرتا ہے، اسے جیسے ڈھالا گیا ہے وہ شکل اختیار کرتا چلا گیا۔۔۔ اور پھر اس نے اس کوزے کو زندہ کیا۔۔۔ کیسے! اپنی روح پھونک کر۔۔۔ تو وہ کوزہ کیا ہوا؟ وہ کوزہ گر کی ذات کا ایک پرتو ہوا، ایک ذرہ ہوا۔۔۔ تو اس ذرے نہیں اگر اس کی پھونک ہے تو گویا وہ خود ہے۔۔۔ تو وہ ذرہ اگر اپنے آپ کو اسی کا ایک حصہ سمجھ لے تو اس میں اس کا تو کوئی دوش نہیں۔۔۔" (26)

مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں علامتوں کے ذریعے ایک پوری فضا تیار کی ہے۔ اس تیاری میں ان کی قوت متخلیہ اور مشاہدہ اہم ہتھیار ہیں۔ ادراک اور اظہار میں انہوں نے علامتی اسلوب کو برتا ہے۔ کیوں کہ الفاظ کا صرف لغوی استعمال محدود اور معلوم معانی تک قاری کی رہنمائی کرتا ہے جبکہ علامتی پیرائیہ اس تفہیم میں اضافہ کرتا ہے۔ اس حوالے سے انیس ناگی لکھتے ہیں:۔

"الفاظ کا علامتی استعمال زبان کا وسیع استعمال ہے، علامتیں دوگنی اہمیت کی مالک ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو یہ انسانی ذہن کی فعلیت کی ترجمانی کرتی ہیں اور دوسری طرف لسانی عمل کے ذریعے انسان الفاظ کی صورت میں تجربات منتقل کرتا ہے"۔ (27)

ناول نگار نے صوفیانہ استغراق اور ذوق کے ساتھ ان علامتی کرداروں کو تراشا ہے۔ یہ ہماری مشرقی روایت اور تہذیبی روح سے کشید کئے گئے مرقعے ہیں جن سے ازلی سچ کو جاننے کی سعی کی گئی ہے۔ جولاہے جو الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے ہیں حقیقت میں وہ کسی صوفی کی مانند دنیا سے بے خبر کسی سچائی کی کھوج میں جتے رہتے ہیں۔ "جولاہوں کی تنہائی اور دیگر انسانوں سے کٹ کر ایک مخصوص چال میں چلنے کی خصلت انہیں وہ سادگی اور بھولپن عطا کرتی تھی، جسے بے وقوفی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ لیکن زندگی کا یہی چلن انہیں بعض اوقات دیگر ذاتوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ وہ کھڈی پر الگ اکیلے بیٹھے کوئی کھدر یا

کھیس بنتے اس لیے سر ہلانے لگتے تھے جو سچل سرمست کے سر میں دھومیں مچاتی تھی وہ انسانی معاشرے کی آلودگی سے بچ کر سوچ کی ایسی صوفیانہ راہوں پر چل نکلتے تھے جہاں شاہ حسین اقرار کر رہے ہوتے تھے کہ۔ انی حسین جولاہانہ اوں مومن اوہ کافر جو آہا سو آہ"(28)

ڈاکیا محمد علی ایک ایسا استعارہ ہے جو اپنے کام پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ وہ کسی خط کی کوئی تحریر بدل نہیں کر سکتا کسی کا نامہ کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتا۔ حتی کہ وقت اور مقام میں تبدیلی بھی اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ تقدیر کے ہاتھوں ایک طرح سے یرغمال ہے۔ نتالیہ جس شخص کی محبت میں گرفتار ہے وہ اسے صرف ایک بار دربار پر نظر آیا تھا۔ عمر میں بڑا شادی شدہ غیر سید مگر ایک سید زادی کا محبوب۔ یہ بھی علامتی حیثیت کا حامل ہے۔ ایسے لوگ قدرتی اوصاف کے مالک ہوتے ہیں اور ان میں ان کا وصف بھی مخصوص لوگ پہچان سکتے ہیں۔ بظاہر عام زندگی بسر کرنے والا یہ آدمی کسی ایسی خوبی سے مزین ہوتا ہے کہ معشوق کو اس میں معبود حقیقی کی کوئی نشانی صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ جس کے پاس آنے کے لیے جس کی بانہوں میں مرنے کے لیے محب ہر جکڑ بندی کو خیر آباد کہہ دیتا ہے۔

المختصر! ڈاکیا اور جولاہا اپنے موضوع اور مرکزی خیال کی مناسبت سے ایک فلسفیانہ ناول ہے جس میں علامتی کرداروں کے ذریعے بقاء و فنا کی حقیقتوں کو آشکار کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے نتالیہ کے کردار کی مدد سے فن کی تخلیق، محبت، عشق، بغاوت اور روحانیت کے ساتھ ساتھ فرسودہ روایات اور ضعیف الاعتقادی کے مختلف پہلوؤں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ بے شک "قربت مرگ میں محبت" کی ایک اگلی کڑی ہے مگر اس کا اسلوب اس سے بہت مختلف ہے اور اس کو الگ انفرادیت بخشتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ مستنصر حسین تارڑ، ڈاکیا اور جولاہا، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2012، ص، 11

2۔ ایضاً، ص13

3۔ ایضاً، ص28

4.Donne, John. Death , be not Proud, Et. Robert Diyani, Newyork: Mc Graw Hill Company, 1998. pg. 663

5۔ ڈاکیا اور جولاہا، ص13

6۔ ڈاکیا اور جولاہا، ص76

7۔ سہیل احمد خان / سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، لاہور، جی سی یونیورسٹی، 2005، ص75

8۔ غفور احمد، نئی صدی۔ نئے ناول، لاہور، کتاب سرائے، 2014، ص163

9۔ ڈاکیا اور جولاہا، ص65-66

10۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے چند اہم زاویے، انجمن ترقی اردو، پاکستان، 2016، ص287

11۔ ڈاکیا اور جولاہا، ص296

12۔ ایضاً، ص135

13۔ غفور احمد، نئی صدی۔ نئے ناول، ص167

14۔ ایضاً، ص117

15۔ ایضاً، ص176

16۔ ایضاً، ص180

17۔ ایضاً، ص205

18۔ ایضاً، ص206

19۔ ایضاً، ص224

20۔ ایضاً، ص229

21۔ ایضاً، ص227

22۔ ایضاً، ص240

23۔ ایضاً، ص222

24۔ غفور احمد، نئی صدی۔نئے ناول، ص173

25۔ مستنصر حسین تارڑ، ڈاکیا اور جولاہا، لاہور، ص281

26۔ ایضاً، ص288

27۔ محمد اجمل، ڈاکٹر، مضمون: علامت اور فردیت، (مشمولہ) علامت کے مباحث، (مرتب) اشتیاق احمد، لاہور، ص86۔

28۔ ڈاکیا اور جولاہا، ص69